علامہ اقبال سے متعلق خصوصی انٹرویو (۳)

* ایم ۔ ایس ناز

ایم اسلم

س: میاں صاحب ! آپ کو علامہ اقبال کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے، کیا آپ ان دنوں کی چند باتیں قارئین فکر و نظر کو بھی بتائیں گے ۔ اور ہاں یہ بھی بتائیے کہ حضرت علامہ سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب ہوئی ؟

ج: میں نے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے ۱۹۰۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں علامہ موصوف ،ڈاکٹر پروفیسر شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے۔ کالج میں آپ ایف۔اے اور بی۔اے کی کلاسوں کو انگریزی اور فلسفہ دونوں مضمون پڑھاتے تھے مگر ایم۔اے کی کلاس کو صرف فلسفہ کی تعلیم دیتے تھے۔ ہماری کلاس کو ایک روز انگریزی ادب اور دوسرے روز فلسفہ ایک ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے۔ میں صرف انگریزی پڑھتا تھا۔ ہمارے کورس میں انگریزی زبان کے مشہور شاعر ''ٹینی سن،، کی نظم کی کتاب ''لی ربٹا،، شامل تھی۔ علامہ پڑھاتے وقت موضوع کے مناسب کچھ فارسی اور اردو کے شعر جو آپ کی تخلیق ہوتے، بلیک بورڈ پر انگریزی اشعار کے ساتھ لکھ دیتے۔ یہ طریقہ اتنا موثر ہوتا کہ روز کا سبق کلاس ھی میں یاد ھو جاتا۔ اس زمانے میں کالج میں سالانہ امتحانات کے موقع پر ایک انعام ''نیچرل شاعری،، کے لئے بھی دیا جاتا تھا۔ سکول کے زمانے میں مجھے کچھ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ میں مشہور قومی شاعر چوھدری خوشی محمد ناظر سے بذریعہ خط و

کتابت مشورہ اور اصلاح لیا کرتا تھا۔ اس بار سالانہ امتحانات کے مو
پر میں نے ''وسط ایشیا،، کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر پیش کی
انعام کا فیصلہ حضرت علامہ ڈاکٹر اقبال کیا کرتے تھے۔ گو مجھ
کالج میں ایک سال ہوگیا تھا لیکن میں نے حضرت علامہ کی خدمت
میں کبھی کوئی نظم یا غزل اصلاح کے لئے پیش نہیں کی تھی
نہ حضرت علامہ کو یہ معلوم کہ مجھے شعر و شاعری کا بھی شو
ہے۔ حضرت علامہ نے پہلا انعام مجھے دیا ۔ جس روز انعام تقسیم
ہوتے تھے اسی روز شام کے بعد کالج کی ڈرامہ سوسائیٹی ایک
کھیل پیش کیا کرتی تھی۔ اس موقع پر لاہور کے کالجوں کے پروفیسر
اور علمی ادبی شہرت رکھنے والے لوگ بطور مہمان مدعو ہوتے تھے
انعامی نظم ڈرامہ کے بعد پیش کی جاتی تھی چنانچہ ڈرامہ ختم ہونے
پر مجھے نظم سنانے کیلئے کہا گیا۔ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر اور بجلی
کی روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لیمپوں سے روشنی کی جاتی تھی۔
میری آواز خاصی بلند تھی اور میں لے سے پڑھتا تھا۔ نظم بڑی پسند کی گئی۔ بہت
پسند کی گئی۔ حضرت علامہ اقبال ان ایام میں اندرون بھاٹی دروازہ
رہتے تھے۔ میرا بھی گھر سے کالج اور کالج سے گھر جانے کا یہی راستہ تھا۔
بحیثیت کالج سٹوڈنٹ میں کبھی کبھی کالج سے واپس جاتے ہوئے
حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ ایک مرتبہ کالج سے آتے
ہوئے حضرت علامہ کی خدمت میں ان کے مکان پر چلا گیا۔ کچھ ادھر
ادھر کی باتوں کے بعد حضرت علامہ مجھ سے مخاطب ہوئے ''اسلم۔
شعر مت کہا کرو۔ نثر لکھا کرو،،۔

کیسی عجیب بات تھی کہ دو روز پہلے مجھے نظم لکھنے پر
پہلا انعام دیا اور تیسرے روز شعر کہنے سے منع فرمایا۔

اس واقع کے کچھ روز بعد میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں کہ انگریزی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کروں۔ آپ نے جواب دیا: کچھ مضائقہ نہیں۔ جب کسی کہانی کو اردو میں منتقل کرو تو اس میں قومی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ الحمدللہ میں نے نصیحت پر پورا پورا عمل کیا اور آج تک جو کچھ لکھا (ناول وغیرہ) قومی اور اسلامی نقطہ نگاہ ہی سے لکھا ہے۔ یہ حضرت علامہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پھر یہ سلسلہ ان کی زندگی تک چلتا رہا۔ اب رہی آخری ملاقات۔ تو حضرت علامہ کے میرے والد سے بہت اخلاص مندانہ تعلقات تھے۔ آپ مہینے میں کم از کم تین چار بار ہمارے ہاں والد صاحب سے ملنے تشریف لایا کرتے اور بالعموم ان سے اسلامی اور قومی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ کچھ عرصہ سے حضرت علامہ کی صحت خراب تھی۔ گلے کی خرابی کی وجہ سے آواز بہت کمزور ہوگئی تھی۔ بڑے ماہر ڈاکٹروں نے علاج کئے۔ لیکن آواز ٹھیک نہ ہوئی۔ آخری زمانے میں لکھنا پڑھنا بالکل بند ہوگیا تھا۔ پاؤں میں بھی تکلیف تھی۔ چلنا پھرنا بھی بند ہو چکا تھا۔ والد صاحب اکثر مزاج پرسی کو جایا کرتے تھے۔ میں بھی ساتھ ہوتا۔ میں نے جب سے ملازمت چھوڑی تھی۔ کثرت سے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مجھے ابتدا ہی سے تمباکو نوشی سے سخت نفرت رہی ہے۔ میں جب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو چودھری محمد حسین مسکرا کر فرماتے: لیجئے سردار جی آگئے۔ سردار جی کا خطاب حضرت علامہ کا عطا کردہ تھا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک روز والد صاحب اور میں صبح ہی صبح علامہ

کی مزاج پرسی کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا دیرینہ ملازم علی بخش جو ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، ملاقاتیوں کے نام حضرت علامہ کو بتا دیتا تھا۔ ہمارے پہنچنے پر بھی اس نے والد صاحب کا اور میرا نام عرض کردیا۔ علامہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ پلنگ کے پاس دو چار کرسیاں رکھی تھیں۔ ہم دونوں سلام عرض کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ والد صاحب نے خیریت مزاج پوچھی۔ باتوں باتوں میں والد صاحب نے حضرت علامہ سے مخاطب ہوکر کہا : ڈاکٹر صاحب انشاءاللہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ بڑھایا اور کہا میاں صاحب ! یہاں میرے پاس چارپائی پر آبیٹھیے۔

حضرت علامہ نے والد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا :۔

"میاں صاحب ! میں گزشتہ دو مہینے سے قدرت کے ایسے ایسے اسرار دیکھ رہا ہوں کہ اب میرا زندہ رہنا ممکن نہیں"

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اجازت لے کر واپس آگئے اور پھر اسی رات حضرت علامہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

س :۔ اقبال کی شخصیت کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے ؟

ج :۔ حضرت علامہ اقبال جب تک زندہ رہے۔ انھوں نے حصول دولت کی کبھی تمنا کی اور نہ اس کے لئے کوشش کی۔ آپ فقر و استغنے کی ایک زندہ تصویر تھے۔ زندگی کی مادی آسائشوں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ آپ صرف اتنا کام کرتے تھے جس سے ان کی خانگی ضروریات آسانی سے پوری ہو سکیں۔

نواب صاحب بھوپال ہزہائینس حمید اللہ خاں آپ کے بڑے مداح اور قدر دان تھے۔ اور اکثر حضرت علامہ کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے بھوپال بلایا کرتے۔ ان دنوں سر راس مسعود ریاست میں وزیر تعلیم تھے ریاست کی طرف سے علامہ کی مہمان نوازی کا کام انہی کے سپرد ہوتا تھا۔ جسے وہ اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علامہ وکالت کا کام چھوڑ چکے تھے۔ حضرت علامہ کی آمدنی کا دارومدار ان کی تصانیف کی اشاعت اور فروخت پر تھا، لیکن اس وقت یہ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ سر راس مسعود اس کوشش میں تھے کہ ریاست کی طرف سے علامہ کو مستقل طور پر ماہانہ وظیفہ مل جائے۔ راس مسعود چپکے چپکے اس کوشش میں مصروف تھے کہ اپنی ریاست کے علاوہ ہزہائینس نظام دکن (ریاست حیدرآباد) اور سر آغا خاں سے بھی علامہ کے لئے مالی امداد حاصل کی جائے۔ چونکہ سر راس مسعود حضرت علامہ کی خوئے خود داری اور ان کی قناعت کی صفت سے پوری طرح واقف تھے۔ اس لئے اس کا انہوں نے بھی حضرت علامہ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ کچھ روز کے بعد دربار (بھوپال) سے حضرت علامہ کے لئے ان کے علم و فضل کے مد نظر پانسو روپے ماہوار مقرر ہوگئے۔ اس کے کچھ روز بعد ہزہائینس آغاخاں اور حکومت نظام سے بھی بڑی امید افزا اطلاعات ملیں۔ اس وقت سر راس مسعود نے آپ کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا۔ حضرت علامہ نے سر راس سے صاف صاف الفاظ میں کہدیا کہ وہ یہ سلسلہ بند کر دیں، انہیں کسی اور جگہ سے مالی امداد لینے کی اب ضرورت نہیں۔ یہ تھی حضرت علامہ کی شان خود داری۔

اسی طرح ایک موقع پر اکبر حیدری نے جو ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے کسی موقع پر حضرت علامہ کو ایک ہزار روپیہ کا

چیک ان کی علمی خدمات کے پیش نظر ریاست کی طرف سے پیش کیا جو حضرت علامہ نے شکریہ کے ساتھ واپس کردیا۔ اس کے ساتھ ایک منظوم قطعہ بھی لکھ بھیجا تھا :

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ھیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاھی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

س :۔ آپ علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو نمایاں حیثیت دیتے ھیں ؟

ج :۔ جہاں تک قومی ترقی کا سوال ہے، کام کی نوعیت کے متعلق وہ فرد اور جماعت میں کوئی فرق نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اگر کسی چیز پر اصرار کرتے تھے تو وہ قوم کا تخلیقی رجحان اور عمل تھا۔ اسی رجحان اور عمل میں انھیں قومی ترقی کی راھیں روشن نظر آتی تھیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مسلسل تگ و دو کرتے رہتے تھے۔

حضرت علامہ کے نقطہ نظر سے انسان، خصوصیت سے مسلمان کی عظمت کا راز اس کے جذبہ خودی کے زندہ رہنے میں ہے۔

اقبال کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ دنیاوی طمطراق کا شکار ہوکر خودی کی شان سے محروم ہو چکے تھے۔

••

انھوں نے اپنے کلام میں یہ نکتہ سمجھانے کی کئی ایک طریق سے کوشش کی ہے کہ انسان کی عظمت کا راز اس کی خود شناسی اور خود آگاہی میں ہے۔ اگر وہ خودی اور عرفان نفس سے محروم ہے تو وہ کچھ بھی نہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

س:۔ آپ کے خیال میں اقبال کا پیغام کیا ہے؟

ج:۔ زندگی میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو اگر کوئی فکر تھی تو وہ صرف مسلمانوں کی بہبود کی، وہ مسلمانوں کی گراں خوابی دیکھ کر بہت بیزار رہتے تھے۔ اور ان کی بیداری کے خواہاں تھے۔ پھر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اسلام اگر زندہ ہوگا تو نوجوانوں کی کوشش سے، ان کے دل میں وطن سے محبت تھی۔ وہ وطن پرستی کو ایک لعنت لیکن حب الوطنی کو ایمان کا تقاضا سمجھتے تھے۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ آج مسلمانوں میں جس قومیت پر فخر کیا جاتا ہے اس کا سر چشمہ یورپ ہے اور اقبال مسلمانوں کی یورپ پرستی سے بھی سخت بیزار تھے۔ اور ان کے نزدیک اسلام اور مسلمان کسی خاص ملک سے تعلق نہیں رکھتے۔ اور ملکی حدود کی تبدیلیاں بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں، آپ کا ارشاد ہے کہ دنیا نے بہت ترقی کی ہے، لیکن محبت اور اخوت کے جوہر سے محروم ہے۔ جہاں تک بنی نوع انسان کی وحدت کا تعلق ہے دنیا اس نعمت سے بالکل محروم ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے یہ جذبہ اس کی اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے لیکن جو چیز زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب، کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت علامہ کا پیغام کیا ہے ؟ تو اس کا جواب ہے کہ وہ ''احیائے دین'' چاہتے تھے جس میں وطن پرستی کی گنجائش ہے نہ باہمی کدورتوں اور نفرتوں کی۔ علامہ کا پیغام یہی ہے۔

س :۔ اقبال ایک عظیم مفکر ہیں، کیا یہ صحیح ہے کہ وہ ایک مستقل نظام فکر کے حامل معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے؟ اگر ایسا ہی ہے تو اس مثالی معاشرہ کے خدو خال اقبال کے ذہن میں کیا تھے ؟

ج :۔ پاکستان کے قیام سے بہت پیشتر حضرت علامہ زبان اور قلم دونوں سے ایک ایسے مستقل معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے جس کا اوڑھنا بچھونا صرف اسلام ہو۔ وہ مسلمانوں کی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ترقی کے لئے مسلمانوں کے لئے اسلام کو مشعل راہ بنانا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ علامہ خود فلسفہ، سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے اور ان کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب، افلاس یا مادی وسائل کی کمی کو نہیں بلکہ اس کا ذمہ دار اس نظام زندگی کو سمجھتے تھے، جو عجلت سے مسلمانوں میں راہ پارہا تھا۔ یہ وہ نظام زندگی تھا جس میں کثرت سے ایسی چیزیں پیدا ہوگئی تھیں۔ جنھیں اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس میں غیر اللہ کی پرستش مشرکانہ رسوم و رواج، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے گریز شامل تھا۔ وہ اس معاشرہ کے طالب تھے جس میں قرآنی تعلیم سب سے ضروری ہے آج کے معاشرہ میں یہ جو حرص و ہوس خدا بیزاری، مردم آزاری تشدد، بدعہدی، حرام و حلال میں تمیز کی کمی عام طور پر پائی جاتی ہے اقبال اس کا علاج قرآن حکیم کا مطالعہ بتاتے تھے۔

س :۔ میاں صاحب ! اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا کیا وہ شرمندہ تعبیر ہوچکا ہے ؟

ج :۔ وہ خواب ابھی تک تو شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا، میں اگر کھل کر کہوں گا، تو بہت سی تلخ حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی۔ میرے خیال میں حضرت علامہ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ جدید تعلیم نے نئی نسل پر بڑا ظلم کیا ہے۔ عقلی اور ظاہری تربیت کے سوا نوجوانوں کے لئے اور کچھ نہیں کیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ تعلیم کے دوش بدوش اس کی روحانی اور اخلاقی اقدار اور اوصاف کو زیادہ سے زیادہ روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی جاتی، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جب حضرت علامہ سے پوچھا جاتا کہ اس کا علاج کیا ہے تو آپ فرماتے ''جہان نو'' ایسا جہان جو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اپنی امت کے سامنے پیش کیا تھا اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو مکمل کر دیا۔ ''نظام نو'' سے حضرت علامہ کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسا نظام جو اسلام کی روحانی اقدار پر قائم ہو وہ نظام جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو عطا فرمایا جسے امت نے دل و جان سے قبول کیا۔